

واصف علی واصف *

اقبال اور خودی

واصف علی واصف ۲۲۵

بھرومی کی قیادت میں عشقِ مصطفیٰ کی عظیم دولت سے مالا مال ہو کر اقبال جب عرفانِ ذات کے سفر پر روانہ ہوا تو اس پر وسیع و جمیل کائنات کے راز کچھ اس طرح منکشف ہونا شروع ہوئے، جیسے عجائبات کا دبستاں کھل گیا ہو۔ اس کا ذوقِ جمال اسے سرور و وجدان کی منزلیں طے کرانا ہوا بارگاہِ حُسنِ مطلق تک لے آیا۔ کائنات اسے مرتفعِ جمال نظر آئی۔ اس نے دیکھا، غور سے دیکھا اور دیکھ کر محسوس کیا کہ موتی، قطرہ، شبنم، آنسو، ستارے سب ایک ہی جلوے کے روپ ہیں۔ اسے قطرہ، دریا، بادل، جھیلیں، سمندر ایک ہی وحدت میں نظر آئے۔ اسے ڈرے میں صحرا اور قطرے میں دریا نظر آیا۔ اس نے فرد اور معاشرے کی وحدت دیکھی، بھیڑ میں تنہائی دیکھی اور تنہائی میں ہجوم نظر آیا۔

اقبال کو یہ کائنات ایک عظیم دھڑکتے ہوئے دل کی طرح محسوس ہوئی۔ اس کے اپنے دل کی دھڑکن، کائنات کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اس نے جلوہ جاناں کو ہر رنگ میں آشکار دیکھا۔ اقبال کو عشق نے اس مقام تک پہنچا دیا، جہاں انسان کو غیر از جمال یا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس مقام پر انسان کہلاتا ہے:

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی جلوہ گاہ میں

اس منزلِ دیدارِ حُسن پر پہنچ کر انسان یہ بیان نہیں کر سکتا کہ یہ کیا مقام ہے؟ صاحبِ منزل خود آئینہ ہوتا ہے، خود زور و، خود نظر اور خود ہی جو نظارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اقبال اس مقام پر ٹھہرا نہیں۔ اس نے جلوہ

حُسنِ کائنات سے معنی کائنات کی طرف قدم بڑھایا۔ اُسے حُسنِ فطرت نے ایک عظیم پیام عطا کیا۔ اقبال نے غور کیا کہ یہ کائنات کیا ہے، انسان کیا ہے، حُسن کیا ہے، عشق کیا ہے، زندگی کیا ہے، موت کیا ہے، مابعد موت کیا ہے، عمل کا مفہوم کیا ہے، عقل کیا چیز ہے، حیرت کیا ہے اور جلوہ کیا ہے، رموز کیا ہیں، ظاہر کیا ہے، باطن کیا ہے، سوز و مستی کیا ہے، سُروِ چراواں کیا ہے، رُخِیلِ کارواں کیا ہے، ”لا“ کیا ہے، ”اللہ“ کیا ہے، غرضیکہ یہ سب کچھ کیا ہے، کیوں ہے، کب سے ہے، کب تک ہے۔ نور و ظلمات کیا ہیں۔ غیاب و حضور کیا ہیں؟ اسی تلاش و تجسس کے دوران اقبال کو اپنے فکر کی عمیق گہرائیوں میں آخر ایک روشن نقطہ دکھائی دیا۔ اور اس نقطے نے ٹکڑے کھول دیا، عقدہ کشائی کر دی، اقبال کو اشیاء و اعمال کی پہچان عطا ہوئی۔ یہ نقطہ اُسے حقیقت آشنا کر گیا۔ اُسے کائنات کی علامتیں نظر آئیں، شاہین کا مفہوم سمجھ آیا، کرگس کے معنی سمجھ آئے، صحبتِ زاغ کی خرابی سمجھ آئی۔ اسی روشن نقطے نے اسے اشیاء کے باطن سے تعارف کرایا، رموزِ مرگ و حیات عطا کیے۔ اُس نے گردشِ شام و سحر کا مقصد اسی نقطے کی روشنی میں دریافت کیا۔ یہ نقطہ پھیلتا تو کائنات بن جاتا اور سمٹتا تو آنکھ کا تیل بلکہ اقبال کا دل بن جاتا۔ اسی روشن نقطے کو اقبال نے خودی کہا ہے۔

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است
زیر خاکِ ما شرارِ زندگی است^۲

چونکہ یہ روشن نقطہ ہر چیز بھی ہے، ہر شے سے الگ بھی ہے، اس لیے اس کی تعریف مشکل ہے۔ خودی کیا ہے، ہر شے کی اصل ہے۔ یہ identity ہے یعنی اس شے کی بنیادی فطری قدر جس سے اس شے کا قیام ممکن ہے اور جس کے بغیر وہ شے قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ انفرادیت ہے جو اس شے کو دوسری اشیاء سے علاحدہ کرتی ہے، ممتاز کرتی ہے، discriminate کرتی ہے۔ یہ وہ تشخص ہے جس سے اس ذات کی بقا ممکن ہے۔ یہی وہ راز ہے جو کسی شے کے زندہ رہنے کا واحد جواز ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو وہ بھی نہیں۔ درحقیقت خودی ہر قابلِ ذکر وجود کے باطن کی نورانی کلید ہے۔ خودی جذبہ اظہارِ حُسنِ باطن ہے۔

وجود کیا ہے، فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا^۳

خودی جوہر ذاتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو کسی ذات کے ہونے اور نہ ہونے کا فرق مٹ جائے۔ خودی ہر وجود میں موجود ہے اور اس کا اپنا علاحدہ وجود نہیں۔ زندگی کی طرح جو، ہر ذی جان میں ہے اور خود میں

نہیں۔ حسن کی طرح جو ہر حسین میں ہے اور اس کا اپنا لگ ٹھوس، قابل محسوس وجود نہیں۔ اس لیے خودی کو ایک علاحدہ مضمون کے طور پر سمجھنا ممکن ہی نہیں۔ خودی کے بیان میں paradox کا ہونا فطری ہے اور خودی کا paradox یا تضاد، تضاد نہیں۔ کیونکہ خودی فرد بھی ہے اور معاشرہ بھی، خودی تلوار بھی ہے اور تلوار کی دھار بھی، خودی مستی لا بحر زنون بھی اور سوز و دروں بھی، خودی ضبط نفس کا سرمایہ بھی ہے اور اطاعت کی عظیم دولت بھی، خودی تقدیر بھی ہے اور کاسب تقدیر بھی، خودی نیابت الہی کا مقام بھی ہے اور اپنی انفرادیت بھی، یہ جلوت بھی اور خلوت بھی، خودی موج آب رواں بھی اور ضبط فغاں بھی، خودی قریب رگب جاں بھی ہے اور دوری شب ہجران بھی، خودی راز بھی ہے اور مخرم راز بھی، ماز بھی ہے نیا ز بھی بلکہ بے نیا ز بھی۔

اقبال نے خودی کو اتنی وسعت عطا کر دی ہے کہ اس کو کسی ایک حوالے سے سمجھنا مشکل ہے۔ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسے confuse کیا جا رہا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اقبال بہر حال اقبال ہے۔ وہ فقیر ہے، عارف حق ہے، مفکر فکر صالح ہے، ملت اسلامیہ کا ایک غیور فرزند پیر رومی کا مرید با وقار ہے۔ فلسفہ شرق و غرب سے آشنا ہونے والا اقبال خودی کے تصور سے جو پیغام دے رہا ہے وہ ایک عظیم پیغام ہے۔ اقبال خودی کے بحر بے پایاں سے افکار کے گہرے گہرے نکالتا ہے اور قاری کے دل و دماغ کو دولتِ لازوال سے مالا مال کر دیتا ہے۔ اقبال کی خودی کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان صاحب ادراک ہو، صاحب نظر ہو۔ اقبال نے یہ شرط عائد کر دی ہے کہ:

نظر نہیں تو مرے حلقہ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالی تنجی اہل^۴

اقبال کا تصور خودی عارفوں کے لیے ہے، اہل نظر کے لیے ہے، شب بیداروں کے لیے ہے، آہ بحر گاہی سے آشنا روحوں کے لیے ہے، دل والوں کے لیے ہے، عشق والوں کے لیے ہے۔ یہ وہ علم ہے جو اہل علم کے لیے نہیں بلکہ اہل نظر کے لیے ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ:

اقبال! یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات^۵

خودی کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان عنوانات کو دیکھیں جن کے ماتحت اقبال نے خودی کو بیان کیا۔ مثلاً کائنات کی خودی... اسلام کی خودی... ملت اسلامیہ کی خودی... عشق و عزم کی خودی... عمل

کی خودی... فکر کی خودی... آزادی و حریت کی خودی، رفتار زمانہ کی خودی اور سب سے اہم خودی، خود آگہی کی خودی۔

وقت اجازت نہیں دیتا کہ ہم ان عنوانات کا خودی کے حوالے سے مکمل جائزہ لیں، بہر حال ایک طائرانہ نظر ہی سہی۔ کائنات خودی کی عظیم جلوہ گاہ ہے۔ اس کی بیداری اور پائیداری خودی کے دم سے ہے۔

خودی کیا ہے، رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے، بیداری کائنات^۶
یہ ہے مقصد گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار^۷
آسمان میں راہ کرتی ہے خودی
صید مہر و ماہ کرتی ہے خودی^۸

اقبال کا مقصد یہ ہے کہ خودی کائنات کے جلووں میں جلوہ گر ہے۔ جو انسان کائنات کے جلووں سے لطف اندوز نہیں ہوتا وہ ان جلووں میں خودی کی کارفرمائی کیسے دیکھ سکتا ہے؟ اقبال کہتا ہے کہ:

خودی جلوۂ بدست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے
سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے^۹

یہ کائنات ہے جو ہمیشہ سے آرہی ہے اور شاید ہمیشہ رہے گی۔ اس کی خودی گردش و استحکام میں ہے۔

اب آئیے اسلام کے آئینے میں خودی کی جلوہ گری دیکھیں۔ اقبال کے نزدیک اسلام ہی محافظِ خودی ہے اور خودی محافظِ مسلمان ہے۔ اقبال اسلام کو بقائے عالم کا ذریعہ سمجھتا ہے، وہ خالی rituals کا قائل نہیں۔

یہ ذکرِ نیمِ شعی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے گمبہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں^{۱۰}

اقبال کاوازی بلند کہتا ہے کہ:

خودی کا بر نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الہ الا اللہ^{۱۱}
خودی سے اس ظلم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ ٹو سبھا نہ میں سبھا^{۱۲}
حکیمی، مسلمانی خودی کی
کلیسی، رمز پنہانی خودی کی^{۱۳}

اقبال خودی کو غلامی سے نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ خودی کے دم سے مسلمانوں کو اپنی عظمت رفتہ

حاصل ہو سکتی ہے۔ اقبال کے ہاں خودی king maker بلکہ kingdom maker ہے۔

تجھے مگر فقر و شہی کا بتا دوں
غریبی میں غمگہانی خودی کی!^{۱۴}
یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی^{۱۵}
خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سخر و طغرل سے کم شکوہ فقیر^{۱۶}

آئیے اب سب سے آخری لیکن سب سے اہم عنوان، خودی اور خود آگہی کی طرف۔ اقبال اپنے

قاری کو دعوتِ خود شناسی دیتا ہے۔ اس کا پیغام یہی ہے کہ:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی^{۱۷}

اپنی پہچان سے ہی اللہ کی پہچان کی طرف قدم اٹھ سکتے ہیں۔ اقبال خودی کو ہی پہچان کا ذریعہ مانتا

ہے۔ اقبال انسان کو پیغام دیتا ہے کہ وہ خود راہِ فطرت ہے۔ انسان ہی مقصد و مدعا ہے تخلیق ہے۔ انسان کو اپنا

مقام پہچاننا چاہیے۔ انسان بالعموم اور مسلمان بالخصوص شاہکا فطرت اور اس کا تشخص خودی کے دم سے ہے

جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رُوسپاہی^{۱۸}

اسی طرح جو قوم محروم خودی ہو اس سے اقبال یوں مخاطب ہے:

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
 قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف^{۱۹}
 اقبال معاشی اور سیاسی غلامی میں گرے ہوئے انسان کو بلند یوں کی طرف پکارتا ہے۔ وہ اسے مایوسی
 کے اندھیروں سے نکال کر امید کی روشن راہوں پر گامزن کرنا چاہتا ہے۔

تو رازِ سخن نکال ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
 خودی کا رازِ داں ہو جا، خدا کا ترجمان ہو جا^{۲۰}
 تُو اپنی خودی کو کھو چکا ہے
 کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر^{۲۱}
 غافل نہ ہو خودی سے، کر اپنی پاسبانی
 شاید کسی حرم کا تُو بھی ہے آستانہ^{۲۲}
 مسلمانوں کو ان کی خودی سے آشنا کر کے اقبال ان کو پیغام دیتا ہے کہ:
 ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
 وہی مہدی، وہی آخر زمانی!^{۲۳}
 خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ
 خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ^{۲۴}

اقبال کے ہاں خودی کی بلندی ہی معصِدِ حیات ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا ارادہ تقدیر

بن جاتا ہے:

خودی شیرِ مولا، جہاں اس کا صید
 زمیں اس کی صید، آسمان اس کا صید^{۲۵}

اقبال خودی کی نگہبانی کا درس دیتا ہے۔ خودداری کا پیغام دیتا ہے۔ اقبال کی خودی، زندگی
 ہے، حیاتِ جاوداں ہے۔ یہ ملتِ اسلامیہ کے لیے ایک عظیم ذریعہٴ حصولِ قوت ہے۔ خدا ہمیں خودی کے اس
 بلند مقام سے آگاہ فرمائے جہاں:

خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے^{۲۶}

نوٹ: یہ مقالہ علامہ محمد اقبال کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ۱۹۷۷ء میں کورنٹس کالج سلوان، ٹاؤن راولپنڈی میں منعقد ایک تقریب
 میں پیش کیا گیا۔

حوالہ جات

- * مرحوم صوفی وانشور (۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء-۱۸ جنوری ۱۹۹۳ء)۔
- ۱۔ امین حسین امین کوٹروی، سرود زندگی مشمولہ کلیات اصغر (لاہور: مکتبہ شعر و ادب، فروری ۱۹۷۹ء)، ص ۷۸۔
- ۲۔ محمد اقبال، اسرار خودی مشمولہ اسرار و رموز (لاہور: شیخ غلامی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۲ء)، ص ۱۸۔
- ۳۔ محمد اقبال، صرب کلیم مشمولہ کلیات اقبال اردو (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء)، ص ۵۴۶۔
- ۴۔ محمد اقبال، بل جبریل، ص ۳۹۔
- ۵۔ محمد اقبال، صرب کلیم، ص ۵۹۱۔
- ۶۔ محمد اقبال، بل جبریل، ص ۴۵۵۔
- ۷۔ ایضاً، ص ۴۵۷۔
- ۸۔ ایضاً، ص ۴۶۹۔
- ۹۔ ایضاً، ص ۴۵۵-۴۵۶۔
- ۱۰۔ محمد اقبال، صرب کلیم، ص ۵۴۷۔
- ۱۱۔ ایضاً، ص ۵۴۷۔
- ۱۲۔ محمد اقبال، بل جبریل، ص ۳۵۹۔
- ۱۳۔ ایضاً، ص ۴۱۲۔
- ۱۴۔ ایضاً۔
- ۱۵۔ ایضاً، ص ۳۷۷۔
- ۱۶۔ محمد اقبال، صرب کلیم، ص ۵۸۹۔
- ۱۷۔ محمد اقبال، بل جبریل، ص ۳۶۷۔
- ۱۸۔ ایضاً، ص ۳۷۷۔
- ۱۹۔ محمد اقبال، صرب کلیم، ص ۵۹۹۔
- ۲۰۔ محمد اقبال، بانگ درا، ص ۳۰۲۔
- ۲۱۔ محمد اقبال، بل جبریل، ص ۳۸۷۔
- ۲۲۔ ایضاً، ص ۳۸۲۔
- ۲۳۔ ایضاً، ص ۴۱۲۔
- ۲۴۔ ایضاً، ص ۴۴۳۔
- ۲۵۔ ایضاً، ص ۴۵۷۔
- ۲۶۔ ایضاً، ص ۳۸۲۔

مآخذ

- اقبال، محمد اسرار و رموز - لاہور: شیخ غلام علی ایڈمنسٹریٹیشنرز، ۱۹۷۲ء۔
_____ - کلیات اقبال اردو - لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء۔
کوٹروی، امین حسین امین - کلیات اصغر - لاہور: مکتبہ شعر و ادب، فروری ۱۹۷۹ء۔